(غلام گردش)

## ہر ساٹھ منٹ میں ایک پاکستانی خودکشی کرتا ہے!

ناہید کا تعلق سرگودھا سے تھا۔ دھان پان کی انتہائی لائق لڑکی۔ 1978 میں سرگودھا بورڈ میں تیسری پوزیشن حاصل کی تھی۔ بھلے زمانے کا سرگودھا بورڈ پاکستان میں امتحان لینے والا سب سے بڑا، وسیع اور معیاری سرکاری ادارہ تھا۔ اندازہ لگایئے کہ آج کا فیصل آباد بورڈ، گجرانوالہ بورڈ اور راولپنڈی بورڈ تمام اسکا حصہ تھے۔ ناہید نے پری میڈیکل ایف ایس سی کی تھی۔ اس دور کے سب سے معتبر میڈیکل کالج یعنی کنگ ایڈورڈ کالج لاہور میں باآسانی داخلہ ہوگیا۔ گرلز ہوسٹل میں کمرہ بھی اَلاٹ ہوگیا۔ بنیادی طور پر ناہید میری کلاس فیلو تھی۔ مگر اس سے کبھی بھی بات نہیں ہوئی تھی۔ ہر وقت پڑھائی میں مشغول نظر آتی تھی۔ گرلز ہوسٹل، پٹیالہ بلاک جانے والی سڑک کے درمیان میں تھا۔ کونے پر ڈاکٹر بھیک کا بہت بڑا گھر تھا۔ ڈاکٹر بھیک کے نام کی پلیٹ گھر کے باہر لگی ہوئی تھی۔ اداکار شاہد بھی وہیں رہتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب، شائد اسکے تایا تھے۔ بہرحال یہ انکا آبائی گھر تھا۔ جب بھی سڑک سے گزر ہوتا تھا تو سارے سٹوڈنٹ غور سے ''بھیک ہاؤس'' کے مین گیٹ کو دیکھتے تھے کہ شائد اداکار شاہد نظر آجائے۔ میڈیکل کالج میں پورے پانچ برس گزر گئے مگر اداکار شاہد کبھی نظر نہیں آیا۔ جیسے جیسے انسان بڑا ہوتا ہے، اسکی ترجیحات بھی یکسر بدل جاتی ہیں۔ آج کوئی یہ کہے کہ فلاں معروف آدمی یا خاتون سے ملنا چاہتے ہو تو یقین فرمایئے، کسی قسم کی کوئی خواہش دل میں موجود نہیں ہے۔ بہرحال گرلز ہوسٹل تھوڑی سی چڑھائی چڑھ کر بہت بڑی عمارت تھی۔ شروع میں وارڈن کا گھر تھا۔ وارڈن، ہمیشہ کالج کی دبنگ ترین خاتون پروفیسر کو لگایا جاتا تھا۔ ویسے کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کے تقریباً تمام مرد اور خواتین پروفیسر نسبتاً سخت طبیعت کے تھے۔ مگر مریضوں کے ساتھ انکا رویہ بہت نرم ہوتا تھا۔ ہمارے لیے کافی سختی ہوتی تھی۔

1979 میں ہمیں کالج میں آئے چار ماہ گزرے تھے۔ اَناٹومی مضمون کا ایک امتحان تھا۔ اسے سٹیج کہا جاتا ہے۔ انسانی جسم کو مختلف حصوں میں تقسیم کر کے طلباء اور طالبات میں پڑھنے کیلئے مختص کیا جاتا تھا۔ دو سال میں اسطرح کے چار امتحان ہوتے تھے۔ سٹیج سے پہلے، سب سٹیج کا مرحلہ ہوتا تھا۔ جو کہ تقریباً ہر ماہ منعقد کی جاتی تھی۔ سٹیج اور سب سٹیج کا باقاعدہ رزلٹ آتا تھا اور نوٹس بورڈ پر لگا دیا جاتا تھا۔ پہلی سٹیج کا امتحان ہوا۔ اکثریت اس میں کامیاب ہوگئی۔ ناہید نے بھی امتحان دیا۔ وہ بھی آرام سے کامیاب ہوگئی۔ مگر سٹیج میں اسکے نمبر پہلے دس بارہ لوگوں میں نہیں تھے۔ یعنی اگر یہ دیکھا جائے کہ اس نے سب سے زیادہ نمبر لیے ہیں تو بات بالکل غلط ہوگی۔ ہاں، ایک اور بات۔ دو سال بعد کے امتحان جسے ''فرسٹ پروفیشنل'' کہا جاتا ہے۔ اس سے سٹیج کے نتائج کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ یعنی یہ تمام نظام طلباء کو ہر وقت محنت کی عادت ڈالنے کیلئے ہوتا ہے۔ یہ روٹین سی ہے۔ آج کیا حالات ہیں ہرگز نہیں جانتا۔ کیونکہ میڈیکل کالج سے فارغ التحصیل ہوئے پینتیس برس ہو چکے ہیں۔ ایک دن شام کو چار بجے کے قریب ہم پانچ چھ طالبعلم کنٹین میں بیٹھے ہوئے چائے پی رہے تھے۔ اچانک ہوسٹل کا چوکیدار ہانپتا کانپتا ہماری طرف آیا۔ اسکی سانس بہت پھولی ہوئی تھی۔ کہنے لگا کہ فرسٹ ائیر کی ایک لڑکی نے گرلز ہوسٹل میں خودکشی کر لی ہے۔ فرسٹ ائیر کا لفظ سنکر ہم سارے چونک گئے۔ کیونکہ ہم سارے اسی کلاس میں تھے۔ تمام اُٹھے اور گرلز ہوسٹل چلے گئے۔ وہاں کہرام

مچا ہوا تھا۔ وارڈن اور بہت سی لڑکیاں ہوسٹل کی چھت پر کھڑی ہوئی تھیں۔ کچھ لڑکیاں زاروقطار رو رہی تھیں۔ چھت سے تھوڑا سا نیچے ایک پرچھتی سی تھی۔ آٹھ دس فٹ کی کالے سیمنٹ کی سلیب۔ اس طرح کی پرچھتیاں چھت کے ہر طرف موجود تھیں۔ آج بھی پرانی عمارتوں میں نظر آتی ہیں۔ چھت سے جب سلیب کی طرف دیکھا تو ایک لاش نظر آئی۔ پورے جسم پر سفید رنگ کے لاکھوں کیڑے رینگ رہے تھے۔ بال، چہرہ، بازو، پاؤں پر صرف زندہ کیڑے موجود تھے۔ خیر بڑی مشکل سے چوکیدار نے ساتھ ملکر لاش کو چھت پر لیکر آئے۔ یہ نعش ناہید کی تھی۔ ڈیڈ باڈی کو ایمبولنس میں منتقل کیا۔ گاڑی پوسٹ مارٹم کیلئے چلی گئی۔ بقیہ کلاس فیلوز کو پتہ چلا تو کافی لوگ پوسٹ مارٹم روم کے باہر کھڑے ہوگئے۔ یہ بھی کالج کا شعبہ تھا۔ بہرحال دو تین گھنٹے بعد، ناہید کے لواحقین آئے اور اپنی سترہ اٹھارہ سال کی بچی کی لاش سرگودھا واپس لے گئے۔ ہر ایک کے ذہن میں سوال تھا کہ بالاخر ناہید نے ایسا کیوں کیا۔ خودکشی کرنے کی کوئی بھی وجہ نہیں تھی۔ چند دنوں بعد، اسکی روم میٹس نے بتایا کہ ناہید، اپنے مقامی کالج میں ہمیشہ فرسٹ آتی رہی تھی۔ جب پہلی سٹیج میں اول نمبر پر نہ آپائی، تو حد درجہ ڈپریس ہوگئی۔ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تعلیمی میدان میں کوئی اس سے آگے نکل سکتا ہے۔ خاموشی سے ہوسٹل کی چھت پر جا کر نیند کی گولیاں کھائیں اور اپنی زندگی کو ختم کرلیا۔ کسی کو بھی پتہ نہ چلا کہ کیا ہوا ہے۔ سہیلیاں سمجھیں کہ وہ اپنے گھر گئی ہوئی ہے۔ جب چھت سے بدبو آنے لگی تو چوکیدار نے جا کر دیکھا تو وہاں ناہید کی لاش پڑی تھی۔ اس نے تعلیمی میدان میں پہلے نمبر پر نہ آنے کو اپنی شکست سمجھا اور سانس کی ڈور ہی توڑ دی۔ خودساختہ ذہنی دباؤ کے سامنے مکمل ہتھیار ڈال دیے۔ آج کسی کو بھی یہ واقعہ یاد نہیں ہے۔ کسی کو بھی نہیں۔

گہرائی سے تجزیہ کریں تو ہمارے معاشرے میں خودکشی بالکل عام سی چیز ہے۔ مگر کوئی اس پر بات نہیں کرتا۔ کوئی اس پر تحقیق کر کے لکھتا نہیں۔ لواحقین بھی گمنام خاموشی اختیار کر لیتے ہیں۔ ایسا کیوں ہے۔ صرف اسلیے کہ ہم اپنے سسٹم کے مشکل حصوں پر پردہ ڈال دیتے ہیں۔ اسکی موجودگی ہی کی نفی کر دیتے ہیں۔ مگر سچ موجود رہتا ہے اور ہمیشہ قائم رہیگا۔ کیا آپکو اندازہ ہے کہ پاکستان میں ہر روز کتنے لوگ اپنی جان خود ختم کر لیتے ہیں۔ جواب توقع سے بہت زیادہ تلخ ہے۔ اس ملک میں روزانہ یعنی چوبیس گھنٹوں میں پندرہ سے پینتیس لوگ خودکشی کرتے ہیں۔ حساب کیا جائے تو ہر گھنٹے، یا ساٹھ منٹ یا تین سو ساٹھ سیکنڈوں میں ایک انسان اپنی جان خود لے لیتا ہے۔ ہمارے ہاں، خودکشی کو اکثر چھپا لیا جاتا ہے۔ لواحقین شرم محسوس کرتے ہیں کہ لوگوں کو بتائیں کہ انکے کسی عزیز نے خودکشی کی ہے۔ لہذا یہ تعداد دوگنی بلکہ تگنی بھی ہوسکتی ہے۔ ڈبلیو ایچ او نے 2012 میں ایک رپورٹ شائع کی تھی۔ اس میں خودکشی کرنے والوں کی تعداد سالانہ تیرہ ہزار تھی۔ یعنی ایک لاکھ کے حساب سے 7.5 اعشاریہ۔ 2016 میں یہ تعداد پانچ ہزار پانچ سو بتائی گئی ہے۔ یعنی تقریباً تین فیصد۔ مگر ماہرین کا خیال ہے کہ اصل تعداد کا کسی کو بھی علم نہیں ہے۔ حتمی امداد و شمار موجود ہی نہیں ہیں۔ ویسے ہمارے جیسے معاشروں میں کوئی بھی چیز حتمی نہیں ہے۔ ہم منافقت اور مبالغہ آرائی کے ملغوبہ میں شرابور لوگ ہیں۔ یہاں نہ کوئی سچ بولتا ہے اور نہ کوئی سچ سننے کا حوصلہ رکھتا ہے۔ بنیادی طور پر ہم زندگی کے ہر شعبے میں جھوٹ کے سہارے زندہ ہیں۔ یہی ہمارا اوڑھنا بچھونا ہے۔ ہم زندہ ہی جھوٹ پر ہیں۔ لہذا یہاں خودکشی کرنے والوں کی اصل تعداد تلاش کرنا ناممکن ہے۔ ویسے یہ بھی عرض کرونگا کہ نظر آنے والے اور سانس لینے والوں کی تعدا کا اندازہ کرنا بھی ناممکن ہے۔

2018 کی ایک تحقیق کے مطابق 38 فیصد لوگوں نے کہا کہ وہ کسی نہ کسی ایسے انسان کو جانتے ہیں جس نے اپنی زندگی خود ختم کی ہے۔ یہ تحقیق پانچ ہزار لوگوں کے گروہ پر مشتمل تھی۔ 45 فیصد لوگوں نے برملا اعتراف کیا کہ انہوں نے خودکشی کرنے کا سوچا مگر حتمی عمل نہیں کیا۔ نو فیصد نے کہا کہ انہوں نے زندگی میں خودکشی کرنے کی کوشش کی ہے۔ اٹھارہ برس سے لیکر چالیس سال کے افراد، خودکشی کرنے والوں کا بہتر فیصد نکلے۔ پنتالیس فیصد لوگوں نے اعتراف کیا کہ ان سے کئی بار، کسی نہ کسی دوست نے ضرور کہا کہ وہ مرنا چاہتا ہے۔ اس تحقیق کے مطابق پاکستان میں خودکشی کرنے کی سات بڑی وجوہات ہیں۔ ذہنی دباؤ، مالیاتی مسائل، لوگوں کی طرف سے ذلت آمیز سلوک، ناانصافی، کسی عزیز کا جدا ہو جانا، باہمی تعلقات میں تناؤ اور خانگی زندگی میں کھچاؤ۔ اسکے علاوہ بھی کئی وجوہات ہوسکتی ہیں۔ مگر ہمارے ملک میں یہ سات مشکلات خودکشی کرنے کی بنیادی وجوہات ہیں۔ مرنے والوں کی اکثریت یہ سمجھتی ہے کہ انکی کوئی مدد نہیں کر سکے گا۔ انکا کوئی مددگار نہیں ہے۔ پھر ایک بہت بڑی سماجی وجہہ کہ میری ناکامی پر لوگ کیا کہینگے۔ انہی اعداوشمار سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ ذہنی تناؤ کی کیفیت میں اکثریت نفسیاتی معالج کے پاس جانے کی استطاعت ہی نہیں رکھتے تھے۔ لیکن سولہ فیصد لوگوں نے بالکل مختلف بات کی کہ خودکشی کرنے کیلیئے بہت ہمت چاہیے اور یہ صرف بہادر لوگوں کا کام ہے۔

اس معاشرے میں اس موضوع پر کبھی کھل کر بات ہی نہیں ہوتی۔ ہم گھنٹوں، ہفتوں، مہینوں بلکہ سالوں، سیاستدانوں پر مکالمہ کرتے رہتے ہیں۔ کرپشن پر لامحدود بحث کرتے ہیں۔ کشمیر بنے گا پاکستان پر اپنا تن، من، دھن لگانے کیلیئے لفاظی کی حد تک بے قرار دکھائی دیتے ہیں۔ ہر حکومت پر بے رحم تنقید کرنے میں مصروف رہتے ہیں۔ ہم وہ بدقسمت قوم ہیں جو ہر دم مباحثوں میں مصروف رہتی ہے۔ پڑھے لکھے اور اَن پڑھ، دونوں کے رویوں میں ناکارہ مکالموں کے حوالوں سے کوئی فرق نہیں۔ اپنے معاشرے کے کمزور پہلوؤں پر کوئی بات ہی نہیں کرتے۔ یہ بھی نہیں سوچتے، کہ ہمارے ہمدردی کے چند بول، مناسب وقت پر ایک انسانی جان کو بچا سکتے ہیں۔ ہم اپنے کسی جاننے والے یا دوست کا حوصلہ بڑھا کر اسے واپس زندگی کے دھارے میں لا سکتے ہیں۔ مگر نہیں، ہم یہ قطعاً نہیں کرینگے۔ ہم میں سے کوئی بھی تسلیم کرنے کی جرات نہیں رکھتا کہ اس ملک میں ساٹھ منٹ یا ہر تین سو ساٹھ سیکنڈ میں ایک انسان خودکشی کر لیتا ہے!

راؤ منظر حیات